علامہ اقبالؒ اور دورِ جدید میں شخصی نشوونما اور رُوحانی فروغ

Allama Iqbal and the Process of Personal Transformation and Spiritual Ascension in the Modern Era

Wajid Mehmood, Ph.D.
Faculty of Arabic & Islamic Studies, Mohi-ud-Din Islamic University (MIU) Nerian Sharif, Azaad Jamu & Kashmir
wajidmahmood95@gmail.com

Shahid Mehmood Qasmi
Mureed-e-Iqbal Foundation, Pakistan
smehmood.dob1807@gmail.com

Ch. Bagh Hussain
Faculty of Arabic & Islamic Studies, Mohi-ud-Din Islamic University (MIU) Nerian Sharif, Azaad Jamu & Kashmir
baghhussain211@gmail.com

Abstract

Over the past three centuries, no other thinker or philosopher among Muslims has presented such a comprehensive and pragmatic framework for human welfare and reformation as Dr. Allama Muhammad Iqbal. Rooted in an unshakable commitment to the revival of human dignity, Iqbal's philosophy offers a profound and actionable system for personal transformation and the spiritual ascension of individuals in the modern era. This research explores three pivotal dimensions of Iqbal's thought: first, the formative influences—his personal life, education, and intellectual milieu—that shaped his revolutionary ideas; second, the authoritative sources from which Iqbal derived his philosophy, underscoring the authenticity and universality of his vision; and third, the applicability of his concept of *Khudi* (Selfhood) in contemporary society, analyzing whether his principles of self-realization and human perfection remain feasible and actionable today. Despite unparalleled advancements in science and technology, modern humanity suffers from a moral and spiritual crisis, largely driven by materialism, moral decay, and the decline of ethical education. Iqbal stands as the only intellectual in the Muslim world who not only diagnosed this crisis but also provided a transformative methodology for its resolution. His concept of *Khudi* serves as a rigorous framework for personal and spiritual development, leading individuals from self-awareness to self-mastery, culminating in the attainment of *Mard-e-Kamil* (the Perfect Man)—the true vicegerent of God. Through a thorough literary analysis of primary and secondary sources, this study reaffirms that Iqbal's ideas remain as relevant and imperative today as they were in his time, offering a blueprint for both individual empowerment and the collective resurgence of the Muslim Ummah.

Keywords: Allama Iqbal, self-knowledge, spiritual development, theory of *Khudi*, Spiritual values, Rumi

کلیدی الفاظ: مصلحِ قوم، اخلاقی انحطاط، اخلاقی وروحانی تشکیل، معرفتِ نفس، مثالی معاشرہ، انسانِ کامل، عشقِ رسول

فی زمانہ انسانیت کو درپیش سب سے بڑا مسئلہ اخلاقی گراوٹ یا دیوالیہ پن کا ہے۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس کی بدولت آج کا انسان اُس شخصی وجاہت اور رُوحانی وقار سے کوسوں دور ہوتا جارہا ہے جو خالقِ کائنات اپنے اِس خلیفہ یانائب میں دیکھنا چاہتا ہے کیونکہ اُس عظیم خالق نے اِس کائنات اور انسان کو بے مقصد یا بے کار تو تخلیق نہیں کیا ہے: ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًاۚ﴾[1] (اے ہمارے رب! تُونے یہ سب (جہانِ رنگ وبو) بے کار نہیں بنایا)۔ گویا عہدِ جدید کا انسان اپنے مقصدِ تخلیق کو ہی فراموش کر چکا ہے۔ سائنسی ترقی اور ٹیکنالوجی کی بہتات میں دولت کا حصول اور آسائشوں کی فراوانی تو سہل ہوگئی ہے مگر کیا کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ اس ساری بھاگ دوڑ میں انسان کی رُوح اور اخلاقیات کا کیا حشر ہو چکا ہے؟ یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ جب کوئی شئے اُس مقصد کو ہی بالائے طاق رکھ دے جس کی خاطر اُس کو معرضِ وجود میں لایا گیا ہو تو اس کی کامرانی کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔ خالقِ کائنات نے کائنات اور انسان کی تخلیق کے مقاصدِ جلیلہ کو نہ صرف جابجا کھول کھول کر بیان کیا ہے بلکہ اُن مقاصد کے حصول کی خاطر ہر دور میں موزوں ترین اسباب بھی بہم فرمائے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبیِ آخر الزماں حضرت محمد ﷺ تک کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء ورُسل مبعوث فرمائے گئے، جنہوں نے انسانیت کو توحید ورسالت، فکرِ آخرت اور اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دی۔ ﴿وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَۚ-فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَ مِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُؕ۔﴾[2] (اور بیشک ہر امت میں ہم نے ایک رسول بھیجا کہ (اے لوگو!) اللہ کی عبادت کرو اور شیطان سے بچو تو ان میں کسی کو اللہ نے ہدایت دیدی اور کسی پر گمراہی ثابت ہوگئی)۔

نبی کریم ﷺ نے توحید و رسالت، فکرِ آخرت، تطہیرِ افکار و نظریات اور تعمیرِ سیرت و کردار کی خاطر نہ صرف نہایت جامع پیغام دیا بلکہ اپنے حسنِ عمل سے اللہ کریم کے مطلوب و مقصود بے شمار "مردانِ کامل" یا" نائبینِ خدا" بنا کر بھی دکھلائے۔ آپ ﷺ خود فرماتے ہیں کہ میں استاد یعنی سکھانے والا بنا کر بھیجا گیا ہوں: انما بعثت معلماً۔[3] آپ ﷺ کی حکیمانہ تعلیم وتربیت اور بلند ترین اخلاقِ حسنہ کے عملی مظاہر سے ریگزارِ عرب کے گمراہ بدوؤں میں ایک ایسا فکری ورُوحانی انقلاب برپا ہوا کہ محض کچھ ہی برسوں میں دنیا کا نقشہ ہی بدل گیا اور ایک ایسا بے مثال معاشرہ وجود میں آ گیا، جس کا اُس دورِ گمراہی میں تصور ہی عبث تھا۔ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ۔[4] (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں اچھے اخلاق (اخلاقِ حسنہ) کو اُن کے اتمام (تکمیل) تک پہنچانے کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں)۔ اسی لیے مولانا الطاف حسین حالیؔ نے اپنی مشہورِ زمانہ نظم "مسدسِ حالی (جس کو مسدسِ اسلام بھی کہا جاتا ہے) میں کیا خوب کہا ہے:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا　　　مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا　　　اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا[5]

صد افسوس کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا، انسان پیامِ محمدی ﷺ سے دُور ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ وہی رذائل و خبائث پھر سے معاشرے میں سرائیت کرتے گئے جن کی بدولت گزشتہ اقوام کی تہذیبیں آج کھنڈرات کی صورت رُوئے زمین پر جابجا پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اِن اقوام نے بھی اپنے رسولوں اور پیغمبروں کی تعلیمات اور دعوتِ عمل کو ٹھکراتے ہوئے اُن سے منہ موڑ لیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ وہ خالقِ کائنات کے غیض و غضب کا شکار ہو کر نشانِ عبرت بن گئیں۔ اللہ کریم قرآنِ حکیم میں ارشاد فرماتا ہے: ﴿فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾[6] (تو زمین میں چل پھر کر دیکھو کیسا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا)۔ گویا خالقِ کائنات کی طرف سے مرتب کیے گئے نظامِ رُشد و ہدایت کے خلاف جانا بارگاہِ ایزدی میں کسی طور قابلِ قبول نہیں۔ اس نظامِ رُشد و ہدایت کے بنیادی عناصر میں، اپنے زمانے کے پیغمبروں اور رسولوں کی غیر مشروط اطاعت کرنا، اُن کی عزت و تکریم اور مقام و مرتبہ پر کوئی حرف نہ آنے دینا، بت پرستی اور شرک سے ہر صورت میں دامن بچانا، مخلوقِ خدا پر کسی قسم کے بھی ظلم و زیادتی کا مرتکب نہ ہونا اور اخلاقی رذائل اور لغویات سے ہر ممکن حد تک اجتناب کرنا شامل ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہی وہ اسباب ہیں جن کو نظرانداز کرنے کی پاداش میں خالقِ کائنات نے گزشتہ اقوام کو صفحۂ ہستی سے یوں نیست و نابود کیا کہ اب محض اِن کی باقیات کے نشانات موجود ہیں اور وہ بھی شاید اِس لیے چھوڑے گئے کہ بعد میں آنے والوں کے لیے نشانِ عبرت ہوں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ دورِ حاضر یا دورِ جدید کا انسان / مسلمان اس دور میں اُن مقاصدِ جلیلہ کا پاسدار ہے، جن کا تقاضا خالقِ کائنات اپنے اِس نائب یا خلیفہ سے کرتا ہے؟ اگر خدا لگتی بات کی جائے تو آج کا انسان / مسلمان اُن مقاصدِ جلیلہ کو بالکل فراموش کر چکا ہے اور اس کی ترجیحات یکسر بدل گئی ہیں۔ اس کی شبانہ روز تگ و دو کا مقصد محض حصولِ زر اور آسائشاتِ دنیوی ہے اور وہ اِن کے حصول کی خاطر انبیاء و رُسل کی بانگِ دہل تکذیب و توہین کرنے، اُن کی تعلیمات کو سرِعام پاؤں تلے روندنے، ہوس پرستی، فیشن، شہرت، اقتدار اور دولت جیسے نہ دکھائی دینے والے بتوں کی علی الاعلان پرستش کرنے اور اپنے مفادات کے حصول و تحفظ کی خاطر مخلوقِ خدا پر جبر و اکراہ کی ہر حد کو پار کرنے سے ذرا برابر بھی نہیں چوکتا۔ یہ وہ حقائق ہیں جن کو جھٹلانا ناممکن ہے کیونکہ آج ہر مذہب کے حقیقی اکابرین اور ہر مکتبۂ فکر کے حقیقی مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ آج کا انسان علوم و فنون اور سائنس و ٹیکنالوجی میں ہوشربا ترقی کے باوجود شخصی انحطاط، فکری زبوں حالی، اخلاقی دیوالیہ پن اور رُوحانی تنزلی کا شکار ہے۔ اُس نے یہ مان لیا ہے کہ یہ ظاہری دنیا ہی سب کچھ ہے اور اسے ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہے۔

تباہ شدہ اقوام میں جو برائیاں فرداً فرداً موجود تھیں، وہ تمام اخلاقی برائیاں اور جرائم مجموعی طور پر آج پوری دنیا کے لوگوں نے اپنا لیے ہیں مثلاً 1914ء اور 1939ء میں دو عالمی جنگوں میں کروڑوں انسانوں کی موت نے بھی لوگوں کو ہوشیار نہیں ہونے دیا اور دنیا اب تک مسلسل جنگ و جدل کے ذریعے مظلوموں کے حقوق غصب کرنے میں مگن ہے۔ آج جھوٹ بولنے میں مہارت کو لوگ چالاکی و فن کاری سمجھتے ہیں اور بے حیائی کو حسن سمجھا جاتا ہے۔ قمار بازی ایک عالمی کاروبار کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور سرکاری و حکومتی سرپرستی میں یہ کاروبار رواج پا رہا ہے۔ کم تولنے کی وجہ سے حضرت شعیب کی قوم نشانِ عبرت بن گئی تھی مگر آج اس فعلِ بد کو مہارت بنا لیا گیا ہے اور خصوصاً برصغیر اور تیسری دنیا کے لوگ اس لعنت میں بری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ شراب کی عالمی تجارت سے صنعتکار لگ بھگ 1.6 ٹریلین ڈالر کی سالانہ آمدن حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح کی انسانیت سوز برائیوں نے مغربی اقوام سے ان کا خاندانی نظام اور ازدواجی زندگی کا سکون و آرام چھین لیا ہے۔ اس اخلاقی زوال کو سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کے

ذریعے عرصہ دراز سے ہمارے ہاں بھی تیزی سے منتقل کیا جا رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس ہوائی شیطان نے 6 سال کے بچے سے 60 سال کے بوڑھے تک کو اسی اخلاقی زوال کی سمت سرپٹ دوڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔[7]

گزشتہ سطور میں یہ تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ کسی بھی مذہب، خطے یا مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے اہلِ دل اور اہلِ درد مفکرین، شعرائے کرام اور مذہبی اکابرین نے آج کے انسان کے اس شخصی انحطاط اور رُوحانی زوال کو پسند نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے ببانگِ دہل اس کی نشاندہی کرتے ہوئے اس سے بہر طور اجتناب کرنے کی تلقین کی ہے۔ عہدِ حاضر کے ایک نمائندہ شاعر اور مفکر، مریدِ اقبال علامہ غلام فریدؔ نقشبندی آج کے انسان کی اس حالتِ زار پر کچھ یوں نوحہ کناں ہیں:

دیکھا خود اقبال نے بھی دورِ حاضر ہے ضرور — لیک اُس کے سامنے اِتنا نہ تھا فسق و فجور
ہے شیاطیں کے تصرّف میں ہماری زندگی! — کر چکا یہ دورِ حاضر حدِّ ممنوعہ عبور
اوج پر ہیں مغربی تہذیب کی سرگرمیاں — آج اِس تہذیب سے پھیلا ہے ہر جانب فتور
اُس نے لالچ سے خریدے رہنمائے مُسلمین — حرصِ دولت میں جو کھو بیٹھے ہیں سب عقل و شعور
اہلِ دیں میں الفت و شفقت نہیں اب نام کی — ظلمتِ تکفیر کا ہر سُو ہوا ہے اب ظہور
عالمِ اسلام پہ غالب ہوئی ہے راہبی — سر بہ خم ہے مشرقی تہذیب اب اِس کے حضور
اے مِرے اقبالؒ! نالاں ہے فریدؔ اِس دور سے — مہرباں کب ہو گا جانے اِس پہ خود ربِّ غفور[8]

آج ایک مصلحِ قوم کی اشد ضرورت ہے

آج دنیا کو ایک "مصلحِ قوم" کی اشد ضرورت ہے، جو آج کے انسان کی اخلاقی تربیت کر سکے کیونکہ اگر بہ نظرِ غائر مشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے آج کے انسان کی شخصیت و کردار میں جو کمی و کجی دکھائی دیتی ہے، وہ تربیت کے فقدان کے سبب ہے اور تربیت کا یہ عالم ہے کہ آج تربیت کے بنیادی ترین ادارے "آغوشِ مادر" سمیت تمام تر ادارے غیر فعال ہو چکے ہیں۔ ایسے میں ایک ایسا "مصلحِ قوم" درکار ہے، جس کے افکار و نظریات اور پیام، باقاعدہ ایک سانس لیتے ہوئے نظام کی صورت میں موجود ہوں اور اسی نظام کے تحت دورِ جدید کے انسان کو حالیہ اخلاقی انحطاط اور رُوحانی زبوں حالی سے نجات دلائی جا سکے۔ اگر حالیہ تاریخ پر نگاہ دوڑائی جائے تو گزشتہ کئی برس سے عالمی منظر نامے پر کوئی ایسا مفکر دکھائی نہیں دیتا، جو ہمارے شاعرِ مشرق، حکیم الامت ڈاکٹر علامہ اقبال کی سطح کا ہو۔ ایسا اس لیے ہے کہ اقبال دراصل "آنے والے زمانوں کے شاعر ہیں"، وہ خود ایک جگہ فرماتے ہیں "من نوائے شاعرِ فرداستم" یعنی میں مستقبل (آنے والے دور) کا شاعر ہوں:

"بے شک وہ ہمارے زمانے کے اور آنے والے زمانوں کے شاعر ہیں، وہ اپنے انقلابی تصورات کے ساتھ زندہ ہیں اور استحصال اور استبداد کی قوّتوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان سمیت دُنیائے اسلام کے مختلف خطوں میں اِس زندہ شاعر کے تصورات سے خوف میں مبتلا حکمران طبقات اقبال کے خلاف ردِّ عمل کو شدید سے شدید تر بنانے میں کوشاں ہیں۔"[9]

اقبال کے ہاں جمود نہیں بلکہ تحرک دکھائی دیتا ہے۔ اُن کے افکار و نظریات میں ایک ایسا فطرتی بہاؤ اور تسلسل ہے کہ اُن کے بیشتر اشعار پڑھ کر آج بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار 100 برس پہلے کے نہیں بلکہ آج ہی کہے گئے ہیں اور آج کے حالات و واقعات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس ضمن میں نوید حسن ملک لکھتے ہیں:

”علامہ اقبال کی تعلیمات کسی ایک خاص وقت، کسی خاص علاقے یا کسی خاص رنگ و نسل کے لیے مخصوص نہیں ہیں۔ اقبال ہر دور کے شاعر ہیں۔ ان کے افکار اور ان کی تعلیمات کا ایک جاندار پہلو یہ بھی ہے کہ وہ فرد کی درست سمت میں رہنمائی اور اس کی اخلاقی و روحانی تشکیل کرنے کے خواہاں ہیں۔ یہی انفرادی تربیت ان کے نزدیک اجتماعی تربیت کا باعث بنتی ہے۔ قوم، ملک یا معاشرہ افراد سے مل کر تعمیر پاتا ہے اور اگر فرداً فرداً قوم کے ہر شخص کی باطنی و اخلاقی تربیت عمدہ طور پر ہو گی تو آخر کار اس انفرادی تربیت کے اثرات اجتماعی شکل میں ظاہر ہوں گے اور اس سے ایک مثالی معاشرہ تشکیل پائے گا۔“[10]

اقبال کے آفاقی پیغام کی حقانیت اور ہر فرد و معاشرے کے لیے افادیت و قبولیت کے باب میں مریدِ اقبال علامہ غلام فرید نقشبندی اپنے ایک مضمون میں انتہائی جامع اور کامل دلائل دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”اقبال نے مسلمان (انسان) کو معرفتِ نفس کا پیغام دیا ہے کیونکہ جب وہ اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے تو اُسے اپنے خالق کی پہچان بھی ہو جاتی ہے اور وہ اپنے مقصدِ تخلیق کو بھی سمجھ جاتا ہے۔ یوں وہ مسلمان (انسان) سے مومن (انسانِ کامل) بن جاتا ہے۔ پھر اس کی زندگی کی ترجیحات بدل جاتی ہیں اور وہ حقیقی اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے تگ و دو کرتا ہے، جو ایک خالصتاً فلاحی معاشرہ ہوتا ہے، جہاں کوئی کسی کے حقوق غصب نہیں کر سکتا۔ یہ وہی معاشرہ ہے جو آج سے چودہ سو برس قبل محسنِ انسانیت حضرت محمد ﷺ نے عرب میں تشکیل دیا تھا، اقبال ایسے ہی معاشرے کے خواہاں تھے۔“[11]

اقبال کون ہیں اور اُن کی تعلیم و تربیت کیسے ہوئی؟

اس موضوع کو آگے بڑھانے سے پہلے ہمیں دیکھنا یہ ہو گا کہ علامہ اقبال کون ہیں اور اُن کا آفاقی پیغام آخر اس قدر جامع، متحرک اور قابلِ عمل کیونکر ٹھہرا کہ آج کے انسان کے لیے ہی نہیں بلکہ آنے والے زمانوں کے انسان کی تربیت کے لیے بھی یکساں طور پر مفید ہے۔ علامہ اقبال 9 نومبر 1877ء کو سیالکوٹ میں صوفی نور محمد اور امام بی کے ہاں پیدا ہوئے۔ انہوں نے جس گھرانے میں جنم لیا وہ ایک مذہبی گھرانہ تھا۔ یہ کشمیری برہمنوں کا ایک گھرانہ تھا جو چند نسلیں قبل ہی مشرف بہ اسلام ہوئے تھا۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ کسی عقیدے، نظریے یا مذہب کو اپنے پرانے عقیدے، نظریے یا مذہب کو ترک کر کے اپناتا ہے تو نئے عقیدے پر وہ نہایت خلوص، ذوق و شوق، دلجمعی اور سختی سے کاربند ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اقبال کے والدین مذہب اسلام پر سختی سے کاربند تھے اور اپنے لختِ جگر کی تربیت بھی انہوں نے عین اسلامی اُصولوں کے مطابق کی۔ بچپن میں ہی اقبال کو لقمۂ حلال کھلانے، فضولیات و لغویات سے دامن بچانے اور قرآنِ حکیم سے دلی لگاؤ اور وابستگی پیدا کرنے میں والدین نے خصوصی توجہ دی۔

گھریلو ابتدائی تربیت کے بعد اقبال نے جب قدم گھر سے باہر نکالا تو مکتب میں اور پھر سکول میں ان کو کئی بہترین استاد میسر آئے، جنہوں نے اقبال کی شخصیت و کردار کی تعمیر میں بنیادی اینٹیں لگائیں۔ میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرنے کے بعد اُن کو انگریزی کا شوق ہوا تو سکاٹش مشن کالج سیالکوٹ کا رُخ کیا جہاں اُن کی ملاقات عربی و فارسی کے مشہور پروفیسر اور علومِ شرقیہ کے باکمال استاد مولوی سید میر حسن سے ہوئی۔ انہی کے زیرِ نگرانی اقبال کو شعر و شاعری اور ادبیات کا ذوق ہوا۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور آئے اور یہاں علی گڑھ کالج کے معروف اور ہر دلعزیز پروفیسر ٹامس آرنلڈ سے فخرِ تلمذ حاصل ہوا۔ پروفیسر آرنلڈ کی اعلیٰ تربیت کے اثرات اقبال کی شخصیت پر بہت گہرے اور دیرپا تھے جن کا اعتراف اقبال نے خود بھی جابجا کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب پروفیسر آرنلڈ واپس انگلستان جانے لگے تو اقبال نے ایک نہایت اثر انگیز نظم "نالۂ فراق" اُن کی یاد میں کہی۔

ستمبر 1908ء میں وہ بسلسلۂ حصولِ تعلیم انگلستان چلے گئے۔ وہاں کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور پروفیسر میک ٹیگرٹ سے مغربی فلسفہ پڑھا۔ پھر یہیں اقبال کی ملاقات انگلستان کے مشہور مستشرقین پروفیسر براونؔ، نکلسن اور سارلی سے ہوئی اور ان کے افکار و نظریات کو سمجھنے کا موقع ملا۔ پھر اخلاقیات Ethics میں ڈگری حاصل کرنے جرمنی روانہ ہوگئے اور کچھ عرصہ میونخ میں قیام کر کے اپنا مقالہ (Thesis) متعلقہ بہ فلسفۂ ایران Metaphysics of Persia تحریر کیا۔ میونخ سے ہی انہیں پی ایچ ڈی PhD کی ڈگری ملی اور جرمنی میں سکونت کے دوران ہی انہوں نے اپنی ایک دوست معلم ایمی ویگاناسٹ سے جرمن زبان بھی سیکھی۔ اُن کا مذکورہ مقالہ بعد میں انگلستان سے شائع ہوا۔ اس کے بعد وہ میونخ سے پھر انگلستان آ گئے اور یہاں سے قانون یعنی بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔ یوں قابلِ رشک گھریلو تربیت کے بعد اقبال نے دینی و دنیوی تعلیم میں بھی خصوصی امتیاز حاصل کیا۔ وہ مشرق و مغرب دونوں کی فلاسفی پر بیک وقت انتہائی عمیق نظر رکھتے تھے۔

اُ۔ اقبال کی قرآنِ حکیم سے وابستگی

اقبال کو "قرآن کا شاعر" بھی کہا جاتا ہے۔ جب ہم اقبال کی فکر اور تصورات کے مآخذ کی تلاش میں نکلتے ہیں تو ہمیں قرآن کی تعلیمات، قرآن سے گہری وابستگی اور لگاؤ فکرِ اقبال کے پیچھے کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ اُن کی شاعری میں قرآنی جذبات و خیالات تو ہیں ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے تو قرآنی آیات کو بڑی خوبی اور مہارت سے شاعری کے سانچے میں ڈھال کر زبان زدِ عام کر دیا ہے اور ایسا وہی شخص کر سکتا ہے جس کو اللہ کریم کی عطا سے پورا پورا فقرِ قرآن حاصل ہو۔ اس ضمن میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ایک قول ہے جس میں انہوں نے اقبال کی قرآن سے وابستگی اور شاعری میں قرآن سے اکتسابِ فیض کو شاید سب سے مؤثر، بلیغ اور دلکش الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "وہ (اقبال) جو کچھ سوچتا تھا قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا، جو کچھ دیکھتا تھا قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا، حقیقت اور قرآن اُس کے نزدیک شے واحد تھے۔" گویا فکرِ اقبال کا بنیادی مآخذ قرآنِ حکیم ہی ہے۔ انہوں نے اسرارِ خودی میں نبیِ آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بارگاہِ بے کس پناہ میں 1915ء میں ایک التجا پیش کی، جس کا لبِ لباب ہے کہ میں جو کچھ (اپنے افکار و نظریات اور شعر و شاعری) امتِ محمدیہ بلکہ ساری انسانیت کی نذر کر رہا ہوں وہ قرآن ہی کی روشنی میں نذر کر رہا ہوں۔ اگر میں کوئی ایسی حکمت، دانش یا فکر پیش کروں جو قرآن مخالف یا قرآن سے متصادم ہو تو پھر میں ایک ایسا مجرم ہوں جسے قیامت کے روز بڑی سے بڑی سزا کا حقدار ٹھہرایا جائے اور پھر خود ہی بڑی سے بڑی سزا کا بتا دیا کہ روزِ قیامت اُن کو رسولِ اکرم ﷺ کی زیارت اور بوسۂ پا کی سعادت سے

محروم رکھا جائے۔ یاد رہے یہ اقبال کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یعنی Lifetime Wish تھی کہ انہیں آخرت میں تاجدارِ کائنات حضرت محمد ﷺ کی زیارت اور اُن کے قدمین شریفین کو بوسہ کی سعادت ملے۔ اقبال فرماتے ہیں:

گر دلم آئینہ بے جوہر است　　در بحرفم غیر قرآن مضمر است

روز محشر خوار و رسوا کن مرا　　بے نصیب از بوسہ ی پا کن مرا[12]

ترجمہ: اگر میرا دل بے نور آئینے کی طرح ہے اور اگر میری باتوں میں قرآن کے سوا کچھ اور پوشیدہ ہے، یعنی اگر میری شاعری اور فکر قرآن کے مطابق نہیں ہے، تو قیامت کے دن مجھے ذلیل و رسوا کر اور مجھے اپنے قدموں کے بوسے سے محروم کر دے۔

ایک اور مقام پر اقبال دعویٰ کرتے ہیں کہ در حقیقت وہ وہی داستان سنا رہے ہیں جو حضرت جبریل علیہ السلام نے سنائی تھی۔

"بہ جبریلِ امیں ہم داستانم
رقیب و قاصد و درباں ندانم"[13]

ترجمہ: میں جبریل امین سے ہم کلام ہوں، مجھے نہ کسی رقیب (مخالف یا حریف) کی پرواہ ہے، نہ کسی قاصد (پیغام پہنچانے والے) کی اور نہ کسی دربان (دروازے پر پہرہ دینے والے) کی۔

ب. اقبال کا جذبۂ عشقِ رسولِ اکرم ﷺ

قرآنِ حکیم سے اس قدر گہری اور دیرپا وابستگی، صاحبِ قرآن سے انتہائی خاص تعلق کے بغیر ہرگز ممکن نہیں۔ وہ عشق و مستی جسے اقبال نے انسان کی شخصیت و کردار کی تعمیر و تشکیل کے لیے لازم گردانا ہے وہ صرف اور صرف عشقِ رسولِ اکرم ﷺ کے توسل سے ہی ممکن ہے۔ اقبال کی یہ سرشاری و سرمستی دراصل آفتابِ مصطفوی کے انوار و تجلیات کی ایک کرن ہی تو ہے۔ اُن کے زندگی کے معمولات، گفت و شنید، شعر و سخن اور افکار و نظریات کا مطالعہ کرنے سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ وہ سر تا پا عشقِ رسولِ اکرم ﷺ میں غرق ہو چکے تھے۔ اُن کے اسی بے پایاں احساسِ عشقِ رسول ﷺ نے انہیں شناسائے روحِ دینِ محمد، حاملِ فقرِ قرآن اور دانائے راز بنا دیا تھا۔ وہ نبی کریم ﷺ کی ذاتِ بابرکات کو حقیقی معنوں میں باعثِ تکوینِ عالم و کائنات اور بعد از خدا بزرگ ترین ہستی جان کر آپ ﷺ کا نہ صرف ادب و احترام بجالاتے تھے بلکہ آپ ﷺ کے شمائل و فضائل، عادات و خصائل، پیکر و سراپا، معجزات و معمولات اور اسوۂ حسنہ کو اپنے شعر و سخن میں سموتے چلے جاتے تھے۔ وہ حضور تاجدارِ کائنات ﷺ کے حقیقی مقام و مرتبہ سے آگاہ بھی تھے اور اس کے معترف بھی:

ہو نہ یہ پھُول تو بُلبل کا ترنّم بھی نہ ہو　　چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسّم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھرمے بھی نہ ہو، خُم بھی نہ ہو　　بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا اِستادہ اسی نام سے ہے　　نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے [14]

اقبال ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

لوح بھی تُو قلم بھی تُو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب[15]

اسی باب میں حقیقی ترجمانِ اقبال، علامہ غلام فرید نقشبندی المعروف مریدِ اقبال فرماتے ہیں:

ہوتا نہ تُو تو کچھ نہ تھا ذوقِ جہانِ چار سو — تیرے طفیل بڑھ گئی دونوں جہاں کی آبرو
کچھ نہ تھا جس وقت تب سے رونقِ محفل ہے تُو — تیری خاطر ہے جہاں، حاصل ہے تُو
سوز و سازِ عشق و مستی کا ہے تُو ہی رہنما — ایک تجھ پہ ہے بھروسہ رہبر کامل ہے تُو[16]

اقبال جانتے تھے کہ نبی کریم ﷺ محبوبِ باری پہلے ہیں اور رسول بعد میں، رسالت تو بہت بعد میں اُس وقت آپ ﷺ کو عطا کی گئی جب انسانیت تاریخِ انسانی کی سب سے بڑی گمراہی میں گھِر چکی تھی۔ آپ ﷺ سے قبل بھیجے گئے تمام انبیاء و رسل کی تعلیمات عملی طور پر بے اثر ہو چکی تھیں اور حضرتِ انسان تقریباً ناقابلِ اصلاح ہو چکا تھا۔ ایسے میں اللہ کریم نے اپنے اُس محبوب ﷺ کے سر پر تاجِ رسالت سجا کر بنی نوع انسان کی تربیت و اصلاح کی خاطر مبعوث فرمایا، جسے اُس نے ازل سے اپنی جلوتوں اور خلوتوں کا ساتھی و ہمراز بنا رکھا تھا۔ پھر چشمِ فلک نے دیکھا کہ وہی ناقابلِ اصلاح انسان محبوبِ خدا کی ارفع ترین تعلیم و تربیت کے زیرِ اثر نہ صرف انسانِ کامل اور اللہ کے خلیفہ کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہو گیا بلکہ رہتی دنیا تک آنے والوں کے لیے نشانِ منزل بھی بن گیا۔

اقبال کو اپنے آقائے نامدار ﷺ کا مقام و مرتبہ جان کر آپ ﷺ کی ذاتِ والاصفات سے ایسا بے پایاں عشق ہو گیا تھا کہ جب کبھی اُن کے سامنے نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کا نامِ نامی لیا جاتا تو فرطِ جذبات سے اُن کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ذکر یعنی درود شریف میں بے انتہا کثرت کرنے کو اپنا معمول بنا لیا تھا۔ پھر اقبال جب اپنے عہد کے مسلمان کو پیغامِ محمد ﷺ سے روگردانی کرنے کے سبب اغیار کی غلامی میں جکڑے ہوئے ایک بدحال اور بے بس مسلمان کی صورت میں دیکھتے تو اُن کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ اقبال کی تخلیقی و علمی مساعی کا بہت بڑا حصہ مسلمانانِ عالم کی کم مائیگی اور خستہ حالی کو ختم کرنے اور اُن کی عظمتِ رفتہ کو بحال کرنے کے جنون کی حد تک بڑھے ہوئے جذبات و احساسات اور افکار و نظریات کی تکرار پر مشتمل ہے۔ ہم سمجھتے ہیں ایسا اس لیے ہے کہ انہیں اپنے پیارے آقا ﷺ کے نام لیواؤں کا یوں ذلیل و رسوا ہونا گوارا ہی نہیں تھا، جو اقبال کے عشقِ رسول ﷺ میں شدت اور وارفتگی کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ پیروکارانِ محمد ﷺ کو بھی عشقِ رسول میں ڈوب کر اور اتباعِ نبوی کی راہ پر دل و جان سے گامزن ہو کر اپنے سابقہ مقام و مرتبہ کے حصول کی خاطر جستجو کرنے کا پیغام دیتے ہیں:

در دل مسلم مقام مصطفیٰ ﷺ است — آبروئے ما ز نام مصطفیٰ ﷺ است[17]

ترجمہ: مسلمان کے دل میں مصطفیٰ ﷺ کا مقام ہے اور ہماری عزت مصطفیٰ ﷺ کے نام سے ہے۔

ہر کہ عشق مصطفیٰ ﷺ سامان اوست — بحر و بر در گوشۂ دامان اوست[18]

ترجمہ: جس کے پاس مصطفیٰ ﷺ کا عشق ہے، سمندر اور خشکی اس کے دامن کے گوشے میں ہیں۔

اقبال کے عشقِ رسول ﷺ کے جابجا بکھرے ہوئے مظاہر کو دیکھ کر ہی شاید منظوم شارح اقبال، علامہ غلام فرید آنقشبندی تحریر کرتے ہیں:

"سلوک کی منازل میں عشق پہلی منزل ہے۔ مگر میرے نزدیک اقبال سلوک و عشق کی یہ منازل طے کرتے کرتے بہت آگے نکل گئے تھے چنانچہ اُن کو اگر "فنافی الرسول ﷺ" کہا جائے تو ہر گز بے جا نہ ہو گا:

تُو غنی از ہر دو عالم من فقیر روزِ محشر عذر ہائے مَن پذیر
گر تُو می بینی حسابم ناگزیر از نگاہِ مصطفیٰ ﷺ پنہاں بگیر[19]

ترجمہ: (اے اللہ!) تو دونوں جہانوں سے بے نیاز ہے اور میں فقیر ہوں۔ قیامت کے دن میرے عذر قبول فرما۔ اگر تو میرا احساب لیناضروری سمجھتا ہے، تو اسے حضور اکرم ﷺ کی نگاہوں سے چھپالے۔

میں یہ سمجھتا ہوں یہ بہت گہری بات ہے، جو عشقِ رسولِ اکرم ﷺ میں فنا ہوئے بغیر کوئی کہہ ہی نہیں سکتا۔"[20]

ج. اقبال کی فکری و رُوحانی تربیت میں مولانا رُومؒ کا کردار

اللہ رب العزت کی آخری کتاب قرآنِ حکیم سے گہری وابستگی اور صاحبِ قرآن حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کے عشق میں غرق ہونے کے ساتھ ساتھ اقبال کی مقربینِ خدا یعنی صاحبانِ تصوف سے بھی بہت اُنسیت تھی کیونکہ وہ باطنی طور پہ متصوفانہ مزاج کے حامل ایک باعلم، باعمل اور نہایت متوازن صوفی تھے۔ حضرت سید علی ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، حضرت مجدد الف ثانی رحمہم اللہ اور دیگر نامی گرامی صوفیہ سے لگاؤ کے علاوہ اقبال کی فکری و رُوحانی تربیت و نشو و نما میں 1207ء کو بلخ میں پیدا ہونے والے فارسی کے ایک عظیم شاعر اور جید صوفی، مولانا جلال الدین المعروف مولائے رُوم یا مولانا رُومیؒ کا کلیدی کردار ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال مولانا رُومؒ کے عقیدت مند ہیں اُن کو اپنا رُوحانی مرشد قرار دیتے ہیں۔ "اسرارِ خودی" کے دیباچہ میں اقبال اس کا اعتراف کچھ یوں کرتے ہیں:

روئے خود بنمود پیرِ حق سرشت کو بحرفِ پہلوی قرآں نوشت
تا بکے چوں غنچہ می باشی خموش نکہتِ خودرا چو گل ارزاں فروش
آشنائے لذت گفتار شو اے درائے کارواں بیدار شو[21]

ترجمہ: اپنے آپ کو ایک حق پرست پیر کے روپ میں ظاہر کیا۔ جس نے پہلوی (فارسی) زبان میں قرآن لکھا۔ (مطلب: اقبال کے خواب میں مولانا روم نے اپنی ذات کو ایک حق پرست پیر کے طور پر پیش کیا اور کہا کہ وہ قرآن کے پیغام کو فارسی زبان میں لوگوں تک پہنچانے والے ہیں)۔ جب تک کہ تو ایک کلی کی مانند خاموش رہے گا، تو اپنی خوشبو کو گل کی طرح سستا بیچے گا۔ (مطلب: رومی اقبال کو یہ نصیحت کر رہے ہیں کہ وہ خاموش نہ رہیں بلکہ اپنے اندر کے علم و حکمت کو دوسروں تک پہنچائیں۔ اگر وہ خاموش رہیں گے تو ان کا علم ضائع ہو جائے گا)۔ اے کارواں کے رہبر، بیدار ہو جاؤ اور گفتگو کے

لذت سے آشنا ہو جاؤ۔ (مطلب: رومی اقبال کو یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ ایک رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں اور انہیں لوگوں کو بیدار کرنا چاہیے۔ اس کے لیے انہیں گفتگو کا فن سیکھنا چاہیے تاکہ وہ اپنے خیالات کو دوسروں تک مؤثر طریقے سے پہنچا سکیں)۔

غالباً وحدت الوجود کے فلسفہ کے علاوہ حیات و کائنات کے دیگر کسی نظریہ و مسئلہ میں اقبال نے مولانا رُومؒ سے اختلاف نہیں کیا بلکہ اقبال کا اندازِ فکر وہی ہے جو اُن کے مرشد رُومیؒ کا تھا۔ اقبال نے مولانا رُومیؒ کی مدد سے یا اُن کی رہنمائی میں جہاں کائنات کے کئی سربستہ رازوں سے پردہ اُٹھایا وہیں خرد و جنوں کی کئی گتھیاں بھی سلجھائیں۔ "اسرارِ خودی" کے انگریزی ترجمہ کے دیباچے میں پروفیسر نکلسن نے لکھا ہے:

> "Although Iqbal is very opposed to the Concept that Hafiz Sherazi presents. However, he pays great tribute to the Spirituality of Jalaluddin Rumi. But he does not accept Rumi's Concept of Self-Renunciation and does not support his existential flight."[22]

علامہ اقبال اور عارفِ رُومؒ میں بے شمار فکری و فنی مماثلتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ جاوید نامہ سمیت اقبال کے دیگر فارسی اور اُردو مجموعہ ہائے کلام کو اگر بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے زمانے سے کم و بیش 650 برس پہلے گزر جانے والے مولانا رُومیؒ نے قدم قدم پر اقبال کی فکری رہنمائی کی ہے۔ یہی تو رُوحانیت ہے اور اسی کو فقر و تصوف کہتے ہیں، اس پر علامہ غلام فرید نقشبندی کہتے ہیں:

مرشدِ اقبال کو بھی ناز تھا اقبال پر ہے مریدِ خاص کا سوز و جنوں بالکل جواں
آئینہ گر نے اسے بخشا ہے ایسا آئینہ جس میں روشن ہو گیا تھا اک جہانِ کن فکاں[23]

گویا اقبال کے افکار و نظریات میں فرد و معاشرہ، مسلم اُمہ بلکہ اگر وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو انسانیت کی اصلاح کے لیے پیامبری کے عناصر دراصل اُن کی عمدہ گھریلو تربیت، بہترین ادارہ جاتی تعلیم، باکمال اساتذہ کی رہنمائی، رُوحِ دینِ اسلام سے گہری شناسائی، فقرِ قرآن سے آگاہی، صوفیہ کرام اور فقر و تصوف سے قلبی وابستگی، مولانا رُومؒ کی رُوحانی رہنمائی اور عشقِ رسول ﷺ کی بدولت آئے ہیں۔ یہی وہ عناصر یا مآخذات ہیں جن کے باعث اقبال ایک انتہائی قد آور اور قابلِ عمل "پیامبر فلاحِ انسانی" اور عظیم مصلحِ قوم کے طور پر اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔

علامہ اقبال کا پیغامِ فلاحِ انسانی

اقبال علیہ الرحمہ کے پیغامِ فلاحِ انسانی کے ذکر سے قبل دو سوال انتہائی اہم اور قابلِ ذکر ہیں، جن کے جواب تلاش کیے بغیر بات واضح نہ ہو گی۔ اس ضمن میں پہلا سوال یہ ہے کہ علامہ اقبال نے جس دور میں اپنے آفاقی افکار و نظریات پیش کیے، وہ کیسا دور تھا؟ یعنی اس وقت ایسے کیا حالات تھے کہ اقبال کو اس طرح کے خیالات کا پرچار کرنا پڑا؟ اس کا جواب ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا، جب غیر مسلم دنیا میں مارکسزم، اشتراکیت، سرمایہ داری اور نام نہاد جمہوریت جیسے دجالی و ابلیسی نظاموں اور نظریات کے تحت مغرب اپنی اخلاقی اقدار اور تہذیب و معاشرت کھو رہا تھا۔ تخت و تاج اور اقتدار کی ہوس میں تاجِ برطانیہ بدمست ہاتھی کی طرح کمزوروں کے حقوق غصب کرتے ہوئے، اپنے پایۂ تخت سے ہزاروں میل دُور تک اپنی سلطنت کو توسیع دے چکا تھا۔ ہوسِ اقتدار و زر اور دجالی و ابلیسی ہتھکنڈوں کی وجہ سے انسان درندگی پر اُتر آیا تھا۔ دنیا 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' کے اُصول کی بنا پر چل رہی تھی اور اسی سبب پہلی جنگِ عظیم ہوئی، جس میں بے شمار انسان لقمۂ اجل بن گئے۔ مسلمان قرآن و حدیث، اسوۂ رسول ﷺ اور دینی اقدار سے رُوگردانی کرتے ہوئے آپس میں دست و گریباں تھے۔ ان کو اپنے گرد و پیش میں ہونے والی علوم و فنون اور سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی سے کوئی

غرض نہ تھی بلکہ اپنے آباواجداد کی قابلِ رشک علمی میراث کے وارث جہالت کی تصویر بن چکے تھے۔ سلطنتِ عثمانیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ ماسوائے افغانستان کے دنیا بھر میں کوئی اور اسلامی ملک آزاد نہ تھا بلکہ دیگر اقوام نے ان کو اپنا غلام بنالیا تھا۔

دوسرا اہم ترین سوال یہ ہے کہ اقبال کے افکار و نظریات اور شاعری میں دیا جانے والا پیغام کہاں سے آیا؟ اس کا جواب ہے کہ دراصل اقبال کا پیغام وہی پیغامِ حق ہے، جو آج سے لگ بھگ چودہ سو برس قبل اُس زمانے کی گمراہ ترین قوم مشرکینِ مکہ کی اصلاح اور تربیت کے لیے مکہ کی گھاٹیوں میں قلبِ محمد ﷺ پر وحی کی صورت میں نازل کیا گیا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ نبی کریم ﷺ چونکہ اللہ کے آخری نبی ﷺ ہیں اور آپ ﷺ کی بعثت کے ساتھ ہی درِ نبوت بند ہو چکا ہے اور سلسلۂ وحی منقطع ہو چکا ہے، اس لیے امتِ محمدی ﷺ اور انسانیت کی اصلاح اور تربیت کے لیے اللہ کریم نے یہی پیغامِ حق بصورتِ الہام اپنے ایک چنیدہ مقرب بندے علامہ اقبال کے دل پر جاری کر دیا اور ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ اُس مخصوص وقت میں امتِ محمدیہ اورانسانیت پیامِ محمدی کو فراموش کرتے ہوئے ذلت اور گمراہی کی دلدل میں دھنس چکی تھی۔ مارکسزم، سرمایہ داری نظامِ معیشت، مادہ پرستی، آمریت اور انسانیت کش جمہوریت جیسے ابلیسی و دجالی نظریات اور نظاموں کے زیرِ اثر اعلیٰ اخلاقی قدریں پامال ہو چکی تھیں، انسانیت اپنا وقار کھو چکی تھی۔

درج بالا دونوں جوابات یہ ثابت کرتے ہیں کہ اُس وقت علامہ اقبال ہی وہ مصلحِ قوم تھے، جو منشائے ربی سے حضرتِ انسان کو درپیش تمام تر نسبی و عصبی پیچیدگیوں، شخصی کوتاہیوں اور روحانی بیماریوں کا شافی علاج تجویز کر سکتے تھے اور پھر زمانے نے دیکھا کہ اقبال نے فلاحِ انسانی کا وہ ہمہ گیر اور قابلِ عمل نسخۂ شفا پیش کر دیا، جس کے نتائج بھی سامنے آئے۔ ان نتائج کو ہم آگے چل کر شاملِ بحث کریں گے۔ فی الوقت دیکھنا یہ ہے کہ اقبال کے فلاحِ انسانی کے اس نظریہ کے نمایاں خدوخال کیا ہیں؟ ان خدوخال کو ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں:

الف: اقبال کا نظریۂ تعلیم وتربیت

ازل سے جب بھی انسان کے مقام کو بلند کرنے کی بات کی جاتی ہے تو اس حوالے سے پہلا مرحلہ اُس کے شعور و آگہی اور تعلیم وتربیت کی افزائش کا درپیش ہوتا ہے۔ اقبال کے ہاں بھی سب سے پہلے انسان کی تعلیم وتربیت کے ذریعے اُس کی ذہنی وفکری نشوونما پر زور دیا گیا ہے۔ اقبال کے نظریۂ تعلیم کو جانچنے کے لیے اُن کی منظوم کاوشوں کے ساتھ ساتھ منثور نگارشات کو بھی سامنے رکھنا ہو گا کیونکہ انہوں نے جہاں انسان کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے انتہائی اثر انگیز اشعار کہے ہیں وہیں وہ اپنی نثری تحاریر اور گفت وشنید میں بھی تعلیمی مسائل کو خوش اسلوبی سے اجاگر کرتے رہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ خود بھی طویل عرصہ تک اس شعبہ سے منسلک رہے اور اس کی تمام پیچیدگیوں اور باریک بینیوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ اُن کے ہاں انسانی تعلیم وتربیت کا ایک انتہائی مربوط، جامع اور حقیقت سے قریب ترین نظام موجود ہے، جو انہوں نے اللہ کی آخری کتاب قرآنِ حکیم، جسے کتابِ ہدایت بھی کہا جاتا ہے، سے اخذ کیا ہے۔

اُس زمانے میں دو بڑے تعلیمی نظام موجود تھے، ایک وہ دینی نظام جو مسلم کی درسگاہوں میں رائج تھا اور دوسرا انگریز سکالر لارڈ میکالے کا دیا ہوا جدید نظامِ تعلیم۔ اقبال نے ان دونوں نظاموں کو رَد کرتے ہوئے اپنے تعلیمی افکار پیش کیے۔ اُن کے نزدیک عرصۂ دراز سے جاری دینی نظام فرسودہ ہو چکا تھا اور تخلیق کی بجائے اندھا دھند تقلید کی روش پر گامزن تھا۔ اس میں کسی قسم کی جدت اور تغیر پذیری کو اس کے کرتا دھرتا اپنے دقیانوسی

خیالات کے سبب اپنانے کو بالکل تیار نہ تھے جبکہ اقبال یہ سمجھتے تھے کہ کوئی بھی نظامِ تعلیم و تربیت اُس وقت تک کارگر نہیں ہو سکتا جب تک وہ عصرِ حاضر (حال اور مستقبل) کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہو۔ اقبال نے اس نظامِ تعلیم کو واشگاف انداز میں رَد کر دیا گو کہ اُس وقت اُن کو اِن دینی حلقوں سے کڑی تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا مگر انہوں نے اس کی بال برابر بھی پرواہ نہیں کی:

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا　　　کہاں سے آئے صدا 'لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللہ'[24]

اور

دُنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار　　　کیا مَدرسہ، کیا مدرسے والوں کی تگ و دَو
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت　　　وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو[25]

مغربی مفکر لارڈ میکالے کے انگریزی نظام کو اقبال نے اس لیے رَد کیا کہ یہ نظام بے دینی اور الحاد کے فروغ کا ذریعہ تھا کیونکہ یہ نظام ایک حاکم قوم کے مفکر نے دانستہ طور پر اپنے محکوموں پر اپنے تسلط کو مزید دوام بخشنے کی غرض سے تشکیل دیا تھا۔ یہ نظام اہلیانِ برصغیر پاک و ہند کو معاش کے مکروہ گورکھ دھندے میں بُری طرح الجھا کر اُن کی رُوح کی موت کا سامان پیدا کرنے کے لیے بنایا گیا تھا تا کہ ایک طرف غلاموں کی خوئے غلامی پختہ تر ہو جائے اور دوسری طرف تاجِ برطانیہ کو ذہنی طور پر پسماندہ کلرک بھی مسلسل میسر آتے رہیں۔ اس صورتحال کا بروقت ادراک کرتے ہوئے ہمارا عظیم مصلح میدانِ عمل میں اترتا ہے اور سینہ ٹھونک کر کہتا ہے:

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا، جس نے　　　قبض کی رُوح تری دے کے تجھے فکرِ معاش[26]
اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم　　　ایک سازش ہے فقط دین و مُروّت کے خلاف[27]
وہ علم نہیں، زہر ہے احرار کے حق میں　　　جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جوَ[28]

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر　　　لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم　　　کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ[29]

اقبال قدیم اور جدید علوم کی آمیزش سے یعنی جدید مغربی علوم کو دینِ فطرت اسلام کے زیرِ اثر لا کر طلبا میں انقلابی فکر پیدا کرنے کے خواہاں تھے تا کہ ہمارے طلبا ہوسِ دنیا اور مادیت سے مرعوب نہ ہوں۔ اقبال کے نظریۂ تعلیم کا مرکزی نقطہ 'خودی' ہے کیونکہ خودی ہی وہ جذبہ ہے جو اوائل عمری میں ہی انسان میں خودداری، غیرت اور خود انحصاری کی لگن پیدا کر دیتا ہے۔ یہی لگن آگے چل کر اُس کی شخصیت میں 'سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کرنے' کی صلاحیتوں کو اُبھارتی ہے۔ اسی لگن سے اُس کے اندر تخلیقیت جنم لیتی ہے، جس سے وہ اپنے لیے 'نیا زمانہ اور نئے صبح و شام پیدا کرنے' کے قابل ہو جاتا ہے۔ یعنی اقبال کا نظامِ تعلیم بچے کو زمانے کی رہبری کا ہنر (دنیا کی امامت کا فریضہ) بچپن میں ہی سکھانے کی قدرت رکھتا ہے:

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے، اُسے پھیر[30]

اقبال کے تعلیمی افکار و نظریات کے حوالے سے درج بالا بحث کو اُن کے 'مخزن' میں شائع ہونے والے ایک مضمون کا یہ اقتباس نہایت عمدگی سے واضح کر دیتا ہے:

"بچوں کے لیے نصاب مرتب کرتے وقت اُن کے درجے کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ وہ نصاب بچوں میں احساسِ ہمدردی اور احساسِ ذمہ داری پیدا کرے۔ ابتدائی تعلیم مادری زبان میں اور دیگر علوم قومی زبان میں پڑھائے جائیں۔ آئندہ نسلوں کو دینی اور غیر دینی (دنیوی علوم) اس طور پڑھائے جائیں کہ وہ مغرب کے تمدن سے مرعوب ہونے کے بجائے اپنی تہذیب اور اپنے دین سے پیوستہ ہو کر دنیا کے ساتھ چلنے کا ہنر سیکھ جائیں۔ انگریزی کو بطور رابطے کی زبان سیکھنا بھی ضروری ہے۔ بچوں کو ایسی تعلیم دی جائے جو محض درسی کتاب اور کمرۂ جماعت تک محدود نہ ہو بلکہ فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو تاکہ بچوں میں انقلابی فکر بیدار ہو جائے۔"[31]

علامہ اقبال کی شاعری کا بیشتر حصہ انسان میں انقلابی رُوح بیدار کرنے کی بات کرتا ہے، دراصل وہ یہ انقلابی رُوح، نسلِ نو میں پیدا کرنے کے خواہاں ہیں۔ اقبال بخوبی جانتے ہیں کہ نوجوان ہی معاشرے کا وہ طبقہ ہیں، جو زندہ اور بیدار ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے ایک مستقبل ہوتا ہے، جس کی خاطر وہ اپنا تن، من اور دھن تک لٹانے کے جذبوں سے سرشار ہوتے ہیں۔ اسی لیے اقبال نے اپنے کلام و پیغام کو ایسے ترتیب دیا کہ وہ محض بیسویں صدی کے نوجوانوں کے لیے نہیں تھا بلکہ آج کے دور میں اور آنے والے زمانوں میں بھی اتنا ہی نافذ العمل ہو گا۔ اقبال کا تصورِ شاہین، دراصل نوجوانوں کے لیے ہی ہے۔ اقبال 'شاہین' کی اصطلاح مردِ کامل کے لیے استعمال کرتے ہیں یعنی وہ اپنی قوم کے نوجوان کو نوعمری میں ہی 'انسانِ کامل' کے رتبے پر فائز دیکھنا چاہتے ہیں۔ اقبال سمجھتے ہیں کہ انسان تعلیم و تربیت کے جو اثرات نوعمری قبول کرتا ہے، وہ کسی اور عمر میں نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی شاعری کا بیشتر حصہ نوجوانانِ ملت کو خطاب کرتا ہے۔ اس ضمن میں مریدِ اقبال علامہ غلام فرید نقشبندی فرماتے ہیں:

"کسی بھی معاشرے میں نوجوان ہی تحرک کی علامت ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ کر گزرنے کی صلاحیت اور جذبہ معاشرے کے دوسرے طبقات کی نسبت کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اقبال نوجوان کو خودی کی بھٹی میں ڈھال کر کندن بنانے کے خواہش مند ہیں۔ میں سمجھتا ہوں خودی کا نظریہ پیش کرتے وقت اقبال کے مرکزِ نگاہ صرف نوجوان ہی تھے کیونکہ عالمِ شباب کے بعد اگر کوئی اس نظریے کو اپنا بھی لے تو وہ نتائج بر آمد ہونے کی امید خاصی کم ہو گی، جو ایک نوجوان سے کی جا سکتی ہے۔"[32]

اقبال نے جابجا اظہار کیا ہے نوجوان ہی اُن کی امیدوں کا مرکز و محور ہیں:

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبّر بھی کِیا تُو نے
وہ کیا گردوں تھا تُو جس کا ہے اک ٹُوٹا ہوا تارا[33]

خِرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق، میری نظر بخش دے[34]

جوانوں کو مری آہِ سحَر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

خدایا! آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے[35]

ب۔ اقبال کا فلسفۂ خودی کیا ہے؟

اقبال کا نظریۂ خودی ہی پیامِ اقبال کا وہ مرکزی اور آفاقی فلسفہ ہے، جس پر عمل پیرا ہو کر کسی بھی رنگ، نسل اور زمانے کا مسلمان بالخصوص اور انسان بالعموم اپنی شخصیت کی تشکیل اور کردار کی تعمیر اس قدر مثالی کر سکتا ہے کہ وہ باآسانی خالقِ کائنات کے خلیفہ / نائب کے اعلیٰ وارفع منصب پر فائز ہو جائے۔ محسوس ہوتا ہے کہ نظریۂ خودی، اقبال کے اندر قدرت نے By default انسٹال کر دیا تھا کیونکہ اُن کے ابتدائی دور کی بہت سی نظموں میں اس کے کئی عناصر ابتدائی اور خام شکل میں موجود ہیں، جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پختہ تر ہوتے گئے اور اُن کے نظامِ فکر میں کلیدی حیثیت اختیار کر کے باقاعدہ ایک جامع فلسفۂ خودی قرار پائے۔ فی الوقت ذہن میں آنے والی اُن کی ایسی چند ایک ابتدائی نظمیں حسبِ ذیل ہیں:

1. خودشناسی اور انسان کی فضیلت کے کچھ خدوخال "انسان اور بزمِ قدرت" نظم میں اپنی ابتدائی شکل میں دیکھے جا سکتے ہیں۔
2. خودی کا دوسرا عنصر "عشق" اُن کی نظم "عقل و عشق" میں موجود ہے۔ اس نظم میں وہ فوقیت "دل" کو ہی دیتے ہیں۔
3. خیر و شر کی کشمکش کے حوالے سے وہ نظم "پرندہ اور جگنو" میں ابتدائی نوعیت کی گفتگو کرتے ہیں۔
4. بقائے دوام کا تصور "کنارِ راوی" میں دیکھا جا سکتا ہے۔
5. جہدِ مسلسل کے عنصر کی جھلک تو ان کے ابتدائی کلام سے ہی نمایاں ہے۔

خودی

فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے دو معنی لیے جاتے ہیں۔ ایک اپنی ذات اور اپنے نفس کا مکمل ادراک و شعور اور دوسرے 'اپنے آپ کے حد سے بڑھے ہوئے احساس' کے ہیں۔ عام طور پر اگر خودی کا لفظ بولا جائے تو سننے والا اس سے غرور اور تکبر مراد لیتا ہے لیکن اسرارِ خودی کے دیباچہ میں اقبال اس کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں: "یہ لفظ اس نظم میں بہ معنی غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا تعینِ ذات ہے۔"[36]

اقبال کے نظریۂ خودی کا ماخذ تلاش کرنے نکلیں تو بلاشبہ یہ کھوج ہمیں قرآنِ حکیم تک لے جاتی ہے۔ قرآنِ حکیم اللہ کی آخری کتاب ہے، جسے صحیفۂ رُشد و ہدایت بھی کہا جاتا ہے۔ گویا اقبال نے اپنا یہ آفاقی نظریہ صحیفۂ رُشد و ہدایت سے اخذ کیا ہے تو پھر یہ نظریہ کیسے بنی نوع انسان کی تربیت و ہدایت کے لیے نافذ العمل نہ ہو گا، شرط صرف یہ ہے اس نظریہ پر من و عن عمل کیا جائے۔ ہم سمجھتے ہیں یہ نظریہ محض قرطاس پر بکھرے ہوئے الفاظ نہیں بلکہ یہ حیاتِ انسانی کا دوسرا نام ہے، یہ اللہ کی عبادت ہے اور عبادت بھی ایسی کہ مقبولِ بارگاہ، کیونکہ روزے کی طرح یہ خالصتاً بندے اور اُس کے رب کا معاملہ ہے۔ خودی یقین کی گہرائی، ذوق کی رعنائی اور ایمان کی پذیرائی کا نام ہے۔ خودی سے انسان ایک جہانِ نو کی بازیافت کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اُس کی آہوں کی رسائی حدودِ جہانِ رنگ و بو کو چیر کر عرش کے کنگروں تک ہو جاتی ہے۔ خودی سے انسان ایک ایسا فرد بن کر اُبھرتا ہے جو اپنی ذات میں ایک مرکز ہوتا ہے۔ وہ جوں جوں قربتِ الٰہی کی منزلوں کو طے کرتا جاتا ہے اُس کی حیثیت و انفرادیت اسی قدر بڑھتی جاتی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ وہ آخر کار وجودِ خالق میں جذب ہو کر اپنی انفرادیت ہی کھو بیٹھے۔ اقبال نے اسرارِ خودی کے مقدمے میں اس کو کچھ یوں واضح کیا ہے:

''خودی کی حیثیت اُس قطرۂ بے مایہ کی طرح نہیں جو دریا میں جا کر فنا ہو جائے اور اپنی ہستی کو کم کر دے (مٹا ڈالے) بلکہ اس قطرے کی سی ہے جو دریا میں جا کر گوہر بنے۔''[37]

کائنات کی ہر چیز میں 'خودی' پائی جاتی ہے، خواہ وہ ایک معمولی ذرّہ ہو یا ایک کوہِ گراں لیکن انسان کی خودی منفرد ہے کیونکہ اُس کا مقام انسان کا دل ہے اور اللہ رب العزت نے انسان کے دل کو ہی اپنا مسکن قرار دیا ہے۔ بقول اقبال:

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تِل میں ہے[38]

خودی کی تربیت

جب ہم خودی کی تربیت کی بات کرتے ہیں تو ہمیں وجودِ انسان کے دو حصوں یعنی جسم اور رُوح دونوں کا مشاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ اقبال صرف جسم یا صرف رُوح پر یقین نہیں رکھتے بلکہ وہ ان دونوں کے باہمی ربط سے حاصل ہونے والے 'کل' کی بات کرتے ہیں۔ یعنی اقبال جسمانی اور روحانی ارتقا کے حوالے سے خودی کے تصور کو بیان کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک خودی کم درجے سے ترقی کرتے ہوئے اعلیٰ درجے تک پہنچتی ہے لیکن آخری درجے تک پہنچ کر بھی اس کا سفر اختتام پذیر نہیں ہوتا بلکہ جاری و ساری رہتا ہے۔ انسان کی شخصی (بادی النظر میں جسمانی) نشو و نما اور رُوحانی فروغ کے لیے اقبال نے تربیتِ خودی کے تین مراحل کا تعین کیا ہے۔ پہلے مرحلے کو اطاعتِ الٰہی، دوسرے کو ضبطِ نفس جبکہ تیسرے مرحلے کو نیابتِ الٰہی کا نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

ا۔ اطاعتِ الٰہی

خودی کی تادیب و تہذیب کا پہلا مرحلہ اطاعتِ الٰہی ہے۔ یعنی خودی انسان کو اُس قانونِ حیات یا قانونِ فطرت کی سختی سے پابندی کا عادی بناتی ہے، جو خالقِ کائنات نے اپنی مخلوقات کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ اقبال نے اپنے شہرہ آفاق فارسی مجموعۂ کلام ''اسرارِ خودی'' میں تربیتِ خودی کے مراحل کو انتہائی آسان اور قابلِ فہم اسلوب میں بیان کیا ہے۔ پہلے مرحلے 'اطاعتِ الٰہی' کو بیان کرنے کے لیے اقبال نے انسان کو اپنے یکتا خالق و مالک کی غیر مشروط اطاعت اختیار کرنے پر زور دیا ہے اور اتنے پیچیدہ نکتے کو سمجھانے کی خاطر وہ اونٹ کی مثال لائے ہیں کہ یہ جانور صبر اور ثابت قدمی کا استعارہ ہے۔ اپنے مالک کی خدمت اور اُس کے حکم پر ہر حال میں سخت محنت و مشقت کرنا اونٹ کا شیوہ ہے یہاں تک کہ تصوف کے معروفِ زمانہ اُصول کے مصداق یہ جانور کم کھا کر، کم سو کر (یعنی اپنے آرام و راحت کی پرواہ کیے بغیر) اور کم بول کر (یعنی شور شرابا/ گلہ شکوہ کیے بغیر) اپنے مالک کے حکم کی بجا آوری کرتا ہے اور اسی بے لوث خدمت اور اطاعت کے باعث وہ مالک کا منظورِ نظر ٹھہرتا ہے۔ اقبال انسان کو ترغیب دیتے ہیں کہ تُو اونٹ کی طرح جانور تو نہیں ہے بلکہ خالقِ کائنات نے تجھے تمام مخلوقات سے افضل تخلیق کیا ہے اور تجھے ان گنت نعمتوں اور بے حساب انعامات سے نوازا ہے، پھر تُو اُس کے احکام سے کیوں مجرمانہ غفلت برت رہا ہے؟ کیا ایسا کر کے تُو اُونٹ کی سطح سے بھی گر نہیں گیا ہے؟ آگے چل کر اقبال کائنات کی دیگر اشیاء مثلاً خوشبو (کہ ہوا جب خود کو پھول کے قید خانے میں مقید کرتی ہے تو خوشبو بنتی ہے)، اسی طرح یہی قید و بند یا پابندی خوشبو کو ہرن کا نافہ بنا دیتی ہے۔ ایک ستارہ جب منزل کی طرف پیش قدمی کرتا ہے تو وہ اپنے مدار یعنی مقرر کردہ راستے کی پابندی کرتا ہے۔ گویا اس کائنات کی ہر ایک مخلوق یا شے

قدرت کی طرف سے اُس کے لیے وضع کیے گئے ضابطوں کی پابند ہے تو پھر انسان کیونکر سرکشی و حکم عدولی کر سکتا ہے۔ اقبال مسلمان سے خطاب کرتے ہوئے اُس کو اُسی قدیم دستورِ حیات یعنی نبی کریم ﷺ کے مقرر کردہ آئین کی (آئین کی سختیوں کا گلہ شکوہ کیے بغیر) پابندی کرتے ہوئے عند حُسن المآب کی ارفع منزل تک پہنچنے کا درس دیتے ہیں:

خدمت و محنت شعارِ اشتر است　　صبر و استقلال کارِ اشتر است
گامِ او در راہ کم غوغاستے　　کارواں را زورقِ صحراستے
نقشِ پایش قسمتِ ہر بیشۂ　　کم خور و کم خواب و محنت پیشۂ
مست زیرِ بارِ محمل می رود　　پاے کوباں سوے منزل می رود[39]

ترجمہ: شتر کا شعار خدمت اور محنت ہے۔ صبر اور استقلال شتر کا کام ہے۔ شتر کا قدم راہ میں کم شور مچاتا ہے۔ شتر کاروان کو صحرا کے پتے پتے سے گزارتا ہے۔ شتر کا پاؤں ہر جنگل کی قسمت بدل دیتا ہے۔ شتر کم کھاتا ہے، کم سوتا ہے اور بہت محنت کرتا ہے۔ شتر بوجھ تلے مست کی طرح چلتا رہتا ہے۔ شتر اپنے پاؤں کو زمین پر مار مار کر منزل کی طرف جاتا ہے۔

۲۔ ضبطِ نفس

خودی جب اپنے آپ کو احکامِ الٰہی کے تابع کر لیتی ہے تو اُس کے اندر نیکی کی ایک قوت پیدا ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی انسان کی وہ نفسانی خواہشات ابھی تک منہ زور ہوتی ہیں، جن کی سرکشی کی کوئی حد نہیں ہے۔ یاد رہے کہ خودی کی تربیت کا دوسرا مرحلہ ہی کٹھن ترین مرحلہ ہے۔ اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پانا ہی اصل خودی ہے کیونکہ یہ خواہشات اس قدر بے لگام ہوتی ہیں کہ ذراسی غفلت سے یہ انسان کو اطاعتِ الٰہی سے بھٹکا کر خودی کو کسی بھی لمحے بے راہ کر دیتی ہیں۔ اقبال اس مرحلے پر ایک مرتبہ پھر اونٹ کی مثال سے سمجھاتے ہیں کہ اونٹ جہاں صبر و استقلال کا پیکر اور محنت و خدمت کا استعارہ ہے وہاں وہ بے حد کینہ پرور اور خود پسند بھی ہے۔ وہ اس قدر ضدی اور سرکش ہے کہ خود پر کسی کے جبر کو انتقام لیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ بالکل اسی طرح انسان کا نفس بھی ضدی، سرکش، کینہ پرور اور خود پسند ہے، جس کو زیرِ نگیں کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ اپنے اندر ہمت پیدا کرتے ہوئے خم ٹھونک کر اپنے نفس کے خلاف میدان میں اُتر جا تاکہ تُو ٹھیکری (مٹی) سے گوہر (موتی) بن جائے یعنی پستی سے اُٹھ کر بلند ہو جائے کیونکہ جس کا اپنے نفس پر حکم نہیں چلتا (جو اپنی نفسانی خواہشات کا گلا نہیں گھونٹ سکتا) وہ دوسروں کا حکم ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ تیرے پیکرِ خاکی کو آب و گل سے تخلیق کیا گیا ہے، اس تعمیر میں محبت اور خوف دونوں کی آمیزش ہے۔ یہی محبت اور خوف نفسِ انسانی کو زیرِ دام لانے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ یعنی دنیا کا خوف، آخرت کا خوف، جان کا خوف، زمینی اور آسمانی آفتوں کا خوف وغیرہ اور اسی طرح مال و متاع کی محبت، دنیا کی محبت، وطن کی محبت، عزیزوں، رشتہ داروں کی محبت، اولاد کی محبت اور بیوی یا عورت کی محبت وغیرہ ہیں جن کے زیرِ اثر بے لگام نفسانی خواہشات کا ایک اژدھام جنم لیتا ہے، جن پر قابو پانا بہت ہی کٹھن مرحلہ ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ یہ نفسانی خواہشات پانی و مٹی کے پیکر (جسم) کو توانا کرتی ہیں اور بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں لیکن رُوح کو کمزور کر دیتی ہیں۔ جب رُوح کمزور ہو جاتی ہے تو انسان کا اپنے خالق سے رشتہ بھی کمزور ہو جاتا ہے اور انسان برائیوں اور بدکاریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں جب تک تیرے ہاتھ میں لاالہ الااللہ کا عصا موجود ہے تُو خوف اور ڈر کے ہر طلسم کو توڑ کر رکھ دے گا۔ جس کے جسم میں حق (اللہ کریم) جاں (رُوح) کی طرح موجود ہے، وہ کبھی باطل کے سامنے جھک نہیں سکتا۔ اس کے سینے سے خوف کا گزر تک نہیں ہوتا کیونکہ وہ صرف اللہ سے ڈرتا ہے۔ کلمۂ توحید کا پہلا حرف "لا" یعنی نفی انسان کو توحید کی مملکت کا باسی بنا دیتا ہے یعنی وہ ہر طرح کی محبت کے پھندوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی شخص محض ایک خواب دیکھ کر اپنے جان سے پیارے بیٹے کی گردن پر چھری رکھ دیتا ہے۔ اس کی نظر میں اس کی اپنی جان کی بھی کوئی وقعت نہیں رہتی۔ ایسا ہی شخص تنہا ہوتے ہوئے بھی ایک لشکر کی صورت ہوتا ہے۔ یعنی جس کو اپنی جان کی بھی پرواہ نہ ہو اس کی قوت کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں نواسۂ رسول ﷺ کی معرکۂ کربلا کی مثال قابلِ تقلید ہے کہ انہوں جبر و استبداد کی ہر انتہا کے باوجود باطل کی بیعت نہیں کی۔ اسی لیے تو حضرت حسینؓ لا الہ الا اللہ کی بنیاد ہیں۔

اس سے آگے چل کر اقبال، تمام ارکانِ اسلام کو لا الہ پر لاگو کر کے ان ارکان کی بدولت "خودی" کی افزائش کے عمل کو ثابت کرتے ہیں۔ لا الہ اگر سیپی ہے تو نماز گوہر ہے۔ نماز مسلمان کے ہاتھ میں بے نیام خنجر کی مانند ہے، جس سے وہ برائی، بے حیائی اور احکامِ خدا سے سر تابی کا قتل کرتا ہے۔ روزہ بھوک اور پیاس پر حملہ آور ہوتا ہے اور بدن کی پرورش کرنے والے خیبر کو فتح کرتا ہے یعنی تن پروری کی بجائے رُوح پروری کو فروغ دیتا ہے۔ حج مومنوں کی فطرت کو منور کرتا ہے یعنی اللہ کی خاطر گھر بار، اولاد، مال و متاع اور وطن کو چھوڑنے کے جذبے کی وجہ سے ایمان میں اضافہ کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ حج پورے عالمِ اسلام کے مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرونے کا بھی سبب ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ مال و دولتِ دنیا کی محبت کو مٹاتی ہے۔ افرادِ ملت میں مساوات پیدا کرتی ہے۔ دولت کو برکت عطا کرتی ہے۔ گویا یہ سب ارکانِ اسلام تیری خودی کو جلا اور تقویت بخشتے ہیں۔

۳۔ نیابتِ الٰہی

اگر انسان خالقِ کائنات کا صحیح معنوں میں اطاعت گزار بندہ بن کر اپنی نفسانی خواہشات کو جب چاہے اور جیسے چاہے زیرِ دام لانے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے تو وہ اس مرتبہ کا حامل ہو جاتا ہے، جسے اوجِ کمال سمجھا جاتا ہے۔ اسی مقام کے بارے میں اقبال فرماتے ہیں:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پُوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے[40]

اس مرحلے میں علامہ اقبال، پہلے دو مراحل کو سر کر لینے والے بندۂ خدا کے لیے اُس کے خالق کی طرف سے اُس پر کی جانے والی نوازشات اور اُس کو بخشے جانے والے اختیار Authority کی طویل فہرست پیش کرتے ہیں کیونکہ خالقِ کائنات کا نائب ہونا کوئی معمولی بات ہے اور نہ ہی مختارِ کل کا خلیفہ یا نائب بے بس و بے اختیار ہو سکتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں، جب انسان اپنے نفس کے اونٹ کا حاکم (یعنی اپنے نفس پر جب، جہاں اور جیسے چاہے قابو پا لینے والا) بن جاتا ہے تو پھر اللہ رب العزت اسے اس دنیا کا دائمی حاکم اور تاجدار بنا دیتا ہے۔ اسے اپنی نیابت عطا فرما دیتا ہے اور یاد رہے، ہر انسان اللہ کا نائب نہیں ہوتا بلکہ یہ نیابت تو اپنے بے لوث جذبۂ اطاعت اور اپنا آپ مارنے کے عوض کمانا پڑتی ہے۔ خدا کا نائب، دراصل اس کائنات کی رُوح کی مانند ہوتا ہے کہ اگر جسم سے رُوح نکل جائے تو جسم مردہ کہلاتا ہے۔ نائبِ خدا کا وجود اسمِ اعظم کا عکس یا سایہ ہوتا ہے۔ اُسے کائنات کے سربستہ رازوں سے آگاہی عطا کی جاتی ہے اور وہی رُوئے زمین پر اللہ کے احکامات (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) جاری کرنے والا ہوتا ہے۔ نیابتِ الٰہی کے منصب پر

بر اجمان ہونے کے بعد وہ ایک جہانِ تازہ کی بنیاد رکھتا ہے۔ اُس کی فطرت وخصلت نیکیوں اور برکتوں سے معمور ہوتی ہے اور یہی نیکیاں اور برکتیں اُس کے قائم کردہ جہانِ تازہ کو اُس دنیا سے ممتاز کرتی ہیں، جس کا وہ پہلے باسی تھا۔ اُس کے مضرابِ جاں سے وہ سدابہار نغمے پھوٹتے ہیں کہ جن کی سرمستی سے بڑھاپے پر جوانی آجاتی ہے۔ وہ لوگوں کے حرمِ دل میں موجود ہوس پرستی، خوف اور انا کے بتوں کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ گویا وہ خدائی صفات کا مظہر بن جاتا ہے:

قہّاری و غفّاری و قدّوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان[41]

کفر وشرک اور معصیت وگمراہی میں گھرے ہوؤں کے لیے وہ قہر بن جاتا ہے جبکہ توحید کے پرستاروں اور انسانیت کے علمبرداروں کے لیے وہ پیکرِ مہروفا ثابت ہوتا ہے۔ یعنی اُس کی دوستی بھی اللہ کی رضا کے تابع اور دشمنی بھی محض اللہ کی رضا کے لیے ہی ہوتی ہے، گویا وہ اپنی ذات کی نفی کر دیتا ہے:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن[42]

وہ نائبِ خدا، علم الاسماء کا مطلوب ومقصود اور سبحٰن الذی اسری کا بھید ہوتا ہے۔ اسے علم اور قدرت دونوں عطا کر دیے جاتے ہیں، جن سے وہ حاملِ یدِ بیضا ودمِ عیسیٰ بن جاتا ہے۔ اُس کے رعب ودبدبہ سے بہتا نیل خشک ہو جاتا ہے۔ اُس کی زبان سے قم باذن اللہ کہنے کی دیر ہوتی ہے کہ چشم زدن میں مردہ بدن تھرکنے لگتے ہیں۔ اس کی شخصیت یعنی اُس کا وجود، کائنات کے وجود کی دلیل بھی ہے اور تفسیر بھی۔ اُس کی نگاہ کی تاثیر سے ذرہ آفتاب ہو جاتا ہے اور اس کے سرمایۂ حیات (فقر وروحانیت) سے کائنات کی قدر ومنزلت میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ شرابِ محبت کے جام بھر بھر کے مخلوق پر لٹاتا ہے۔ جنگ وجدل پر آمادہ لوگوں کو صلح جو بنا دیتا ہے:

گر شتر بانی جہانبانی کنی — زیب سر تاج سلیمانی کنی
تا جہاں باشد جہاں آرا شوی — تاجدار ملک لا یبلیٰ شوی
نائب حق در جہاں بودن خوش است — بر عناصر حکمراں بودن خوش است
نائب حق ہمچو جان عالم است — ہستی او ظل اسم اعظم است
از رموز جزو و کل آگہ بود — در جہاں قائم بامر اللہ بود[43]

ترجمہ: اگر شتر دنیا کا بانی ہوتا تو، سلیمان کا تاج سجاتا۔ جب تک دنیا قائم ہے تو دنیا کا زیور بنے گا، ہمیشہ کے لیے بادشاہ بنے گا۔ دنیا میں خدا کا نائب ہونا بہت اچھا ہے۔ خدا کا نائب دنیا کی جان کی مانند ہے۔ اس کی ہستی عظیم نام کا سایہ ہے۔ وہ جزو اور کل کے رازوں سے واقف ہے۔ وہ دنیا میں خدا کے حکم سے قائم ہے۔

ج۔ اقبال کا مردِ کامل / مردِ مومن یا انسانِ کامل

نیابتِ الٰہی کی مسندِ عالیہ پر براجمان یہی بندۂ خدا، درحقیقت علامہ اقبال کا "مردِ کامل / انسانِ کامل / مردِ مومن" ہے، جس کے ہاتھ، کان اور آنکھ سے مظاہرِ قدرت سرزد ہونے لگتے ہیں۔ یہی تو انسان کی معراج ہے، جس کی بدولت اُسے اشرف المخلوقات قرار دیا گیا اور روزِ ازل دیگر تمام مخلوقات کے سجدۂ تعظیم کا سزاوار ٹھہرایا گیا تھا۔ اقبال کے ہاں ایسے بندۂ خدا کے لیے مردِ حق، بندۂ آفاقی، بندۂ مومن، مردِ بزرگ، مومن، جانباز، مجاہد، غازی، مردِ مسلمان، مردِ مومن، مردِ قلندر، پراسرار بندے جیسی ہمہ گیر اصطلاحات جابجا برتی گئی ہیں، جو سب دراصل ایک ہی ہستی کے نام ہیں اور یہ ہستی خودی کا پیکر ہوتی ہے:

نُقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقیں — اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز[44]
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زور بازو کا! — نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں[45]
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات — مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند[46]
وہ سحَر جس سے لَرزتا ہے شبستانِ وجود — ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا[47]
نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے — خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے[48]

د۔ اقبال کے فارسی مجموعۂ کلام "جاوید نامہ" میں بحالیِ عظمتِ انسان کے عناصر

اقبال کے درج بالا انقلابی و آفاقی نظریاتِ اصلاح و فلاحِ انسانی محض اُن کے ذہن کی اختراع یا مفکرانہ و فلسفیانہ موشگافیوں کا مجموعہ نہیں ہیں بلکہ فطرت کے دستورِ حیات سے کلی طور پر ہم آہنگ ہیں۔ ان افکار و نظریات کو اللہ کریم کی نازل کردہ کتابِ رُشد و ہدایت اور ہادیٔ برحق حضرت محمد ﷺ کے زریں ارشادات و تعلیمات سے کشید کیا گیا ہے۔ اس کی واضح مثال اقبال کا معرکۃ الآرا فارسی مجموعۂ کلام "جاوید نامہ" ہے۔ اس کتاب میں اقبال نے عصرِ نو کے انسان کی شخصی، روحانی، عصبی، نسبی اور فکری پیچیدگیوں کو زندہ مثالوں، تاریخی کرداروں اور ڈرامائی مکالموں کی صورت میں اجاگر کرتے ہوئے ان سب سے انسان کو چھٹکارا دلانے کے لیے انتہائی فعال اور قابلِ عمل سفارشات مرتب کی ہیں۔ اقبال کی یہ کتاب شروع تا آخر رجائیت کی رُوح سے اَٹی پڑی ہے۔ اس کے مطالعہ سے انسان میں احساسِ حقیقی نہ صرف بیدار ہوتا ہے بلکہ برسرِ عمل بھی ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی لامحدود ترقی کے باعث جنم لینے والی اخلاقی و رُوحانی مشکلات پر غلبہ پانے اور اشرف المخلوقات کا مقام حاصل کرنے کا مکمل احساس حاصل کر جاتا ہے۔

اقبال کے تمام فارسی کلام کو دیکھا جائے تو وہ "جاوید نامہ" میں ایک الگ ہی تمکنت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کتاب کا سنِ اشاعت 1932ء ہے، جو اُن کی فنی پختگی بلکہ معراج کا زمانہ تھا۔ یہ وہ دور تھا جب دنیا بھر کے مسلمان شدید انحطاط کا شکار تھے اور غیر مسلم (عام انسان) ابلیسی و دجالی افکار کے زیرِ اثر مقامِ انسانیت سے نیچے گر چکے تھے۔ دنیا میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظاموں میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ لگ بھگ دو ہزار کے قریب اشعار پر مشتمل یہ کتاب "جاوید نامہ"، انسانی فکر کی رفعتوں کو آشکار کرتی ہے۔ اس کتاب کا مبدا معراجِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے، جو تہہ در تہہ مسلمانوں کو سربلندیٔ اسلام کی دعوت دیتی ہے اور غیر مسلموں کو معراجِ انسانیت تک پہنچنے کا اہتمام کرتی ہے۔

درج بالا دلائل و براہین یہ ثابت کرتے ہیں کہ اقبال کے "بحالیِ عظمتِ انسانی" کے یہ نظریات 100 فی صد قابلِ عمل بھی ہیں اور نافذ العمل بھی۔

حاصلِ بحث

دورِ جدید اپنی روز افزوں ترقی اور تمام تر رنگینیوں ورعنائیوں کے باوجود اخلاقی انحطاط اور تہذیبی زوال کا دور ہے۔ ہر رنگ و نسل، خطے اور مکتبۂ فکر کے افراد کی واضح اکثریت مادہ پرستی اور ذاتی مفادات کے پیشِ نظر اپنے مقام و مرتبہ، مقاصدِ تخلیق حتیٰ کہ مالکِ تخلیق (اللہ رب العزت) کو ہی فراموش کر بیٹھی ہے۔ ایسے میں بنی نوع انسان کی اخلاقی ورُوحانی تربیت ناگزیر ہو چکی ہے تا کہ دنیا میں جاری جبر و فسطائیت، مادہ پروری، کفر و الحاد، فحاشی و عریانی غرضیکہ ہر طرح کی غیر انسانی سرگرمیوں کے آگے بند باندھا جا سکے۔ ایسا کرنے کے لیے ایک آفاقی مفکر کی ضرورت ہے، جس کے دیے گئے بحالیِ عظمتِ انسان کے منشور کو نافذ العمل کرتے ہوئے بنی نوع انسان کو اس کے فطرتی مقام و مرتبہ کا ادراک و شعور دے کر اُس کو نیابتِ خدا کی کرسی پر پھر سے براجمان کیا جا سکے۔

ہم انتہائی مستند اور مدلل تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دنیا کی گزشتہ 300 برس کی تاریخ میں شاعرِ مشرق، حکیم الامت ڈاکٹر علامہ محمد اقبال لاہوری کے علاوہ کوئی دوسرا مفکر یا دانشور ہمیں دکھائی نہیں دیتا، جو فلاح و اصلاحِ انسانی کا ایک ہمہ گیر اور قابلِ عمل لائحہ عمل پیش کرتا ہو۔ درج بالا بحث میں ہم نے تین نکات کو ثابت کرنے کی کاوش کی ہے۔ پہلا نکتہ یہ ہے کہ "بحالیِ عظمتِ انسانی" کے علمبردار اس مفکر یعنی علامہ اقبال کی اپنی شخصیت، گھریلو ماحول، تعلیم و تربیت کتنی مثالی تھی کہ اُس نے اس قدر ہمہ گیر نظریات پیش کر دیے، جو رہتی دُنیا تک انسان کو اُس کے اصل مرتبے پر فائز کرنے میں معاون ثابت ہوں گے۔ دوسرا نکتہ یہ پیش کیا گیا ہے کہ اقبال کے پیش کردہ ان اعلیٰ و ارفع نظریات کو انہوں نے کہاں سے اخذ کیا ہے کیونکہ کسی بھی نظریے کی حقانیت کے لیے یہ بات از حد ضروری سمجھی جاتی ہے کہ وہ نظریہ یا فلسفہ جن مآخذات سے کشید کیا گیا ہے، اُن کی حقیقت اور حیثیت کیا ہے۔ تیسری بات جو ہم نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ یہ ہے کہ دورِ جدید کے انسان کی شخصی نشو و نما اور رُوحانی فروغ کے لیے اقبال کے تعلیمی افکار، اُن کے نظریۂ خودی کے انسان پر اطلاق کے مراحل اور پھر تکمیلِ خودی کے بعد انسان کا "مردِ کامل" (خالقِ کائنات کا حقیقی خلیفہ / نائب) کی منزل تک پہنچ جانا ہر مکتبۂ فکر اور ہر عہد کے انسان اور معاشرے کے لیے 100 فی صد ممکن اور نافذ العمل بھی ہے کہ نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آج کے انسان اور مسلمان کو درپیش جملہ انفرادی و اجتماعی مسائل کا تسلی بخش اور نتیجہ خیز حل فکرِ اقبال میں مضمر ہے۔

حوالہ جات

---

[1] ۔القرآن،191:3

[2] ۔القرآن،36:16

[3] ۔ التبریزی، ولی الدین، مشکوٰۃ المصابیح (لاہور: مکتبہ رحمانیہ) کتاب العلم، ح:257

[4] ۔ احمد بن محمد بن حنبل، المسند (القاہرہ: دار الحدیث) ح:8952

[5] ۔ الطاف حسین حالی، مولانا: "مسدس حالی" (لاہور: تاج کمپنی لمیٹڈ، 1962ء) ص 15

[6] ۔القرآن،36:16

[7] ۔ محمد امین اللہ: قوموں کا اخلاقی زوال اور تباہی کے اسباب، مشمولہ "جسارت سنڈے میگزین" (آن لائن۔ 10 مارچ 2024ء)

[8] ۔ غلام فرید نقشبندی، مریدِ اقبال: مشرق راہی کے زیر اثر (نظم) مشمولہ "مریدِ اقبال"، (واہ کینٹ: دی واہ پبلیکیشنز، جولائی 2016) ص 67,68

[9] -فتح محمد ملک، پروفیسر: مریدِ اقبال،(واہ کینٹ: دی واہ پبلیکیشنز، جولائی 2016)ص۔بیک فلیپ

[10] -نوید حسن ملک، پروفیسر: تعلیماتِ اقبال کا عہدِ حاضر میں اطلاق۔ مشمولہ "اُردو ریسرچ جرنل"(آن لائن۔01 اپریل 2015ء)

[11] -غلام فرید نقشبندی، مریدِ اقبال: "مرشد اقبال کا وطن کب اور کیسے آزاد ہو گا" مشمولہ "اقبال کا کشمیر بنے گا اقبال کا پاکستان"،(واہ کینٹ: دی واہ پبلیکیشنز، ستمبر 2019)ص 8

[12] -علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر: "کلیاتِ اقبال فارسی"(لاہور: مکتبۂ دانیال، ن۔م)ص 23

[13] -علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر: "کلیاتِ اقبال فارسی"(لاہور: مکتبۂ دانیال، ن۔م)ص 21

[14] -علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر: "کلیاتِ اقبال اردو"(لاہور،: اقبال اکادمی پاکستان، 2021ء)ص 236

[15] -علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر: "کلیاتِ اقبال اردو"(لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 2021ء)ص 438

[16] -غلام فرید نقشبندی، مریدِ اقبال: "سدرہ سے آگے"(واہ کینٹ: دی واہ پبلیکیشنز، نومبر 2019)ص 147

[17] -علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر: "کلیاتِ اقبال فارسی(اسرارِ خودی)"،(لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، 1981)صفحہ نمبر 19

[18] -علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر: "کلیاتِ اقبال فارسی(پیامِ مشرق)"،(لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، 1981)صفحہ نمبر 190

[19] - یہ رباعی علامہ اقبال کی ہے مگر ان کی کسی کتاب یا کلیات میں موجود نہیں ہے۔ http://dailypakistan.pk/ تو-غنی-از-ہر-دو-عالم-من-فقیر/

[20] -غلام فرید نقشبندی، مریدِ اقبال: "مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں۔۔" مشمولہ "سدرہ سے آگے"،(واہ کینٹ: دی واہ پبلیکیشنز، نومبر 2019)ص 12

[21] - علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر: "کلیاتِ اقبال فارسی"،(لاہور: مکتبۂ دانیال، ن۔م)ص 214

[22] - Reynold A. Nicholson: Secrets Of Self(Asrar-e-Khudi by M. Iqbal): [London: Mcmillon & Co. Ltd, 1920]Page No.14

[23] -غلام فرید نقشبندی، مریدِ اقبال: "مریدِ اقبال"(واہ کینٹ: دی واہ پبلیکیشنز، جولائی 2016)ص 55,97

[24] -علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر: "کلیاتِ اقبال اردو"(لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 2021ء)ص 381

[25] -ایضاً: ص 598

[26] -ایضاً: 596

[27] -ایضاً: ص 599

[28] -ایضاً: ص 678

[29] -ایضاً: ص 238

[30] -علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر: "کلیاتِ اقبال اردو"(لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 2021ء)ص 178

[31] -علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر: "بچوں کی تعلیم وتربیت، مشمولہ مخزن از شیخ عبد القادر"،(لاہور: مخزن پریس: شمارہ فروری 1902ء)ص 11

[32] - غلام فرید نقشبندی، مریدِ اقبال: "انٹرویوز سیف اللہ ربانی مشمولہ نظریہ، اسلام آباد"(اسلام آباد، پاکستان پریس، اپریل 2018)ص 20

[33] -علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر: "کلیاتِ اقبال اردو"(لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 2021ء)ص 207

[34] -ایضاً: ص 451

[35] -ایضاً: ص 347

[36] -علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر: "مقدمہ اسرارِ خودی، اقتباس مشمولہ درسی کتاب ایم اے اُردو، اقبالیات"،(لاہور: مکتبۂ دانیال، 2018-19)ص 476

[37] -علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر: "مقدمہ اسرارِ خودی، اقتباس مشمولہ درسی کتاب ایم اے اُردو، اقبالیات"،(لاہور: مکتبۂ دانیال، 2018-19)ص 477

[38] -علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر: "کلیاتِ اقبال اردو"(لاہور،: اقبال اکادمی پاکستان، 2021ء)ص 455

[39] -علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر: ''کلیاتِ اقبال فارسی'. اسرارِ خودی، اطاعت '، (لاہور: مکتبۂ دانیال، ن۔م) ص73

[40] -علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر: ''کلیاتِ اقبال اردو''(لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، 2021ء) ص388

[41] -ایضاً: ص573

[42] -ایضاً: ص558

[43] -علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر: ''کلیاتِ اقبال فارسی، اِسرارِ خودی، نیابتِ الٰہی''، (لاہور: مکتبۂ دانیال، ن۔م) ص78

[44] -علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر: ''کلیاتِ اقبال اردو''(لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 2021ء) ص424

[45] -ایضاً: ص301

[46] -ایضاً: ص578

[47] -ایضاً: 526

[48] -ایضاً: ص383